

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

ہمارا دستوری مستقبل کیا ہے؟ کسی سیاسی تقدیر ہمارے پلے پڑنے والی ہے؟ ہم کیا ہیں، ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ ہم کب سے آئے ہیں، ہمیں کب سے جانا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے اور ہمارا راستہ کدھر سے جاتا ہے؟ دنیا کے نعتیہ پرکسی ریاست کے ابھرنے سے پہلے اور کسی نئی بیہشت اجتماعی کے ظہور سے قبل اس سوال کا جواب وہ عوامل طے کر چکے ہیں جو ایک مملکت اور ایک معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں۔ کچھ خیالات ہوتے ہیں جو دوسرے خیالات کو شکست دے کر آگے اچکتے ہیں۔ کوئی نظریہ ہوتا ہے جو دوسرے نظریات کو توڑتا پھوڑتا، ان کے سازگار جوہر کو اپنے اندر جذب کرتا اور ان کے ناسازگار عناصر کو پاؤں میں روندنا واقعات و حوادث کی زمام ہاتھ میں لے چکتا ہے۔ ایک اجتماعی ذہن ہوتا ہے جو نئی تاریخ کے گونا گوں مراحل کی بھٹیوں میں ڈھلتا ڈھلتا اور تحریکیت کے کسی خاص طرح کے سانچوں میں کوئی متعین شکل اختیار کرنا فرود پر اپنا پر تو ڈال چکتا ہے۔ ایک نصب العین بے شمار اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں، فلاح و بہبود کے تصورات، معاشرے کے بے شمار تفصیل مقاصد کو اپنے اندر سمیٹتا لگا ہوں کو اپنے اوپر مرکوز کر چکتا ہے۔ ایک خاص اخلاقی تصور مؤثر قدروں اور رعایات کے سوسٹموں سے میراب ہو جو کہ پروان چڑھ چکتا ہے۔ ایک ذوقِ جمالیات مستعداً فطری ماحول اور تاریخی ارتقاء کے ملے جلے اثرات سے اپنے معیارات طے کر چکتا ہے۔ اس سارے سرمایہ تعمیر کو ساتھ لے کر جب کوئی کاروانِ حیات آزادی و استقلال کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو کسی تامل و توقف کے بغیر تعمیر نو شروع ہو جاتی ہے۔ نقشہ تعمیر موجود ہوتا ہے، مسالہ تیار ہوتا ہے، انجینئر اور محارر پوری صلاحیتوں کے ساتھ آگے آجاتے ہیں اور معاشرے کے تمام افراد مزدور بن کر اپنا تعاون پیش کر دیتے ہیں۔

لیکن تاریخ انسانی میں ایک ایسی انوکھی ریاست اور ایک ایسے نرے معاشرے کی واحد مثال پیش کرنے کا شرف پاکستان کو حاصل ہوا ہے جس کے ساڑھے سات برس کوئی تعمیری قدم اٹھائے بغیر گذر گئے۔ بلکہ اتنی لمبی مدت جس میں تاریخ دوسری سرزمینوں میں نہ جانے کتنی پلٹیاں کھا چکی ہے اور دوسرے معاشروں میں حوادث و تغیر نے کیا کیا گل کھلا دئے ہیں۔ یہاں بھی تک یہ

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن بھی طرح بہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریچر کی سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے منہ جانب اللہ اور بدحق اور فوجہدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طیف پر پڑھتے ہیں، قرآن جسے خانوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نتھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انتہا درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے دینی نصاب کا اہم جزو ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چین زاروں پر ہمیشہ ابر بہار بن کے برسی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سولہ ہزار سالہ لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کارفرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علمی المرغم کسی دوسری شکل میں کر دیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ لجنہ اور کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی چھو منتر سے اس کے مزاج کو بدلا جاسکتا ہے، اور نہ اسے نظر انداز کر کے ایک انچھ می آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا منظر ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے جس قوم کا اجتماعی ضمیر مرجاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور بعد میں اسے لے جانا چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ وہ نت نئے سانچوں میں پڑ کر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نت نئی محنت کو

قوموں کی دستوری ہیئت کے بنانے میں بڑا حصہ ان کے اساسی معتقدات کا ہوتا ہے۔ خدا اور کائنات اور انسان اور زندگی کی حقیقت کے بارے میں جو تصورات راسخ ہو کر عقیدے بن جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ ہر قوم کا ایک نہ ایک فلسفہ ہوتا ہے جو معاشرے میں رچ بس جاتا ہے۔ فلسفے اور نظریے اور عقیدے کے بغیر کبھی کوئی اجتماعی ہیئت موجود نہیں پائی گئی۔ اب کیا دنیا کی ہم ہی وہ انوکھی قوم ہیں جس کے فکر و عمل کی کھینٹی میں ایمان و اعتقاد کا سرے سے کوئی تخم تھا ہی نہیں، اور اگر کبھی تھا بھی تو وہ گل مرط چکا ہے اور اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں جو اندر سے زور کر کے فطری طور پر اپنی کوپلیں نکالے، بس جو کچھ چاہو باہر سے لا کر گاڑ دو۔ ہمارے پاس کوئی تصویر حقیقت نہیں ہے، ہم کوئی خیالات نہیں رکھتے، کسی طرح کی متاع افکار ہمارے پاس نہیں ہے، کسی نوعیت کے متلی شعور سے ہم بہرہ اندوز نہیں ہیں، ہمارا کوئی نادیدہ نگاہ نہیں، کوئی طرز فکر نہیں۔ ہم یونہی جڑوں کے بغیر پیدا ہو گئے تھے کے بغیر بڑھتے چلے گئے، رگوں میں غذا جذب کئے بغیر، ہم برگ و بار لاتے رہے۔ اعتقاد اور فکر کے بغیر لکڑی اور پتھر اور گدھے اور خچر کا تصور تو کیا جاسکتا ہے، آدمی اور آدمی کے کسی معاشرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ہم نہ صرف حقیقت کا ایک خاص امتیازی اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ہی اعتقاد نے ہمیں ایک نئی ملت کی حیثیت سے تشکیل دی ہے، ہمیں پروان چڑھایا ہے اور ہمیں تہی صدیوں تک اپنے مستقل وجود کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔ اور سخت ناسازگار حالات میں زندہ رکھا ہے۔ اس اعتقاد سے ہمارا نقطہ نظر اور ہمارا طرز فکر بنتا ہے، اس سے افکار کا ایک مستقل سرچشمہ ہمارے اندر پھوٹ کے بہ رہا ہے۔ اس سے ہمارے مخصوص خیالات کی کلیاں نکل نکل کر کھلتی ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا وہ امر بیچ ہے جس سے انگلیں اور آرزوئیں اور اماندے اور عملی منصوبے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اعتقاد مضبوط رہے تو ہم مضبوط رہتے ہیں۔ یہ کمزور پڑ جائے تو ہم بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یہ دب جائے تو ہم بھی دب جاتے ہیں، یہ ٹھنڈا ہونے لگے تو ہم بھی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ یہ مرجھا جائے تو ہم بھی مرجھا جاتے ہیں۔ یہ نئی کر دٹ لے تو ہم بھی نئی کر دٹ لینے لگتے ہیں، اور خدا نخواستہ یہ اگر مرجائے تو ہم بھی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ یہی ہمارا مرکزی شرعی حیات ہے۔ (SPARK OF LIFE)

ہمارا اساسی اعتقاد زندگی کے متعلق یہ ہے کہ یہ کائنات ایک قوت برتری پیدا کردہ اور امی کی منظم اور آئینی سلطنت کی اس سلطنت میں نام موجودات کی طرح ہمارے لیے اگر کوئی جگہ ہے تو اس قوت برتری کی بندگی و اطاعت کی جگہ ہے۔ ہم

خود وہ قوت برتر نہیں ہیں جو اس نگرہی کا راج چلا رہی ہے۔ نہ ہم اس کے شریک کار اور حصہ دار ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے لئے ایک ہی مقام نظر آتا ہے جو اس کی رعیت بن کر رہنے کا مقام ہے۔ ہمارا اسامی اعتقاد جہاں وہ ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ وہ قوت برتر ہمارے بھلے برے سے بے تعلق اور بے توجہ نہیں ہے بلکہ اس نے زندگی بسر کرنے کے لیے آقا اور بادشاہ اور مالک الملک (SOVERIGN) ہونے کی حیثیت سے ہمیں ایک ضابطہ، ایک ہدایت نامہ اور کام کرنے کا ایک نقشہ دیا ہے۔ اس ضابطے اور ہدایت نامے اور نقشے پر کام کرنے کے لیے اس نے عملی نمونہ پیش کر دینے کے لیے ہمارے اندر سے بہترین انسان کھڑے کئے ہیں۔ پھر ہمارا اسامی اعتقاد یہ ہے کہ اس قوت برتر جسے ہم اللہ اور خدا کہتے ہیں۔ کی دی ہوئی ہدایت اور اس کے مامور انبیاء کے عملی نمونے سے ہٹ کر زندگی کو جو بھی شکل دی جائے وہ ہمارے فطری موقف سے متصادم، امرِ حق کے بالکل خلاف اور نتائج و اثرات کے لحاظ سے مہلک ہے۔ پھر ہمارا اسامی اعتقاد یہ ہے کہ حق اور باطل، خیر اور شر، صلاح اور فساد، نیکی اور بدی کی تقسیم جس طرح اللہ تعالیٰ اور انبیاء نے کر دی ہے اس کے خلاف کوئی اور تقسیم قابل قبول نہیں ہے۔ پھر ہمارا اسامی اعتقاد یہ ہے کہ ہم انہی زندگی کی سرگرمیوں میں غیر مستول اور غیر جوابدہ نہیں ہیں بلکہ ہمیں اپنے کارنامہ زندگی کا پورا پورا سلب پائی پائی کر کے اسی آقا اور مالک الملک کے سامنے پیش کرنا ہے کہ کہاں تک ہم وفا دار رعیت بن کر رہے اور کہاں تک ہم نے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور پھر وفاداری پر امن و مسرت کی دوامی زندگی کی جزا اور بغاوت پر دکھ اور عذاب کی دوامی زندگی کی سزا ملنے والے ہیں۔ یہ ہے اسامی اعتقاد کا وہ بیج جس سے ہمارے سارے عقیدے، نظریے، افکار، خیالات اور تصورات رونما ہوتے ہیں اور جو ہمارے زندگی کے ہر شعبے کے لیے ہماری ضرورت کے اصول ہمیا کرتا ہے۔ اس اعتقاد کے ہوتے ہوئے ہم کوئی ایسا ریاستی ڈھانچہ نہیں سوچ سکتے جو خدا کی مالکیت کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر تجویز کیا جائے ہم کوئی ایسا دستور نہیں بنا سکتے جس میں ہم اپنے آپ کو اسی زندگی کی پوزیشن پر نہ رکھیں جو کچھ کہ خدا کی اس سلطنت میں از روئے واقعہ اور از روئے فطرت ہے۔ ہم کوئی ایسا سرچشمہ قانون اور کوئی ایسے قانونی اصولیات کہیں سے لے کر اپنا نہیں سکتے جو کتاب و سنت کے مصدر و ماخذ سے ٹکراتے ہوں۔ ہمارے سیاسی رجحانات کا کوئی بہاؤ اس اعتقاد سے آزاد ہو کر واقع نہیں ہو سکتا۔

اس اعتقاد کے اثر سے آزاد ہو کر ہماری سیاسی تعمیر اور ہمارے دستوری مستقبل کی تشکیل دو ہی صورتوں میں قابل تصور ہے

ایک یہ کہ یہ اعتقاد سرے سے نہ کوئی تقاضا رکھتا ہو، نہ ہمارے اندر سے کوئی تحریک کرے۔ نہ ہمارے سوچنے کے انداز پر اپنا پر تو ڈالے۔ یقین جانئے کہ دنیا کا کوئی کمزور تریں اعتقاد ایسا غیر موثر اور غیر فعال اور غیر محرک نہیں ہو سکتا، کجا کہ معاملہ ایسے اعتقاد کا ہو جس نے بار بار تاریخ انسانیت میں عظیم درجے کی ملتیں برپا کی ہوں، جس نے تاریخ کے دھار کا رخ موڑ موڑ دیا ہو، جس نے تمدن و تہذیب کے نئے نئے طوفان کھڑے کر دیئے ہوں اور جس نے نظام ہائے باطل کی جہی ہوئی قوتوں کو اکھیڑ اکھیڑ بھینکا ہو۔ یہ وہ اعتقاد ہے جو ایک طرف دماغوں کو فتح کر لینے والا عقل استدلال رکھتا ہے اور دوسری طرف دلوں میں بڑے بڑے معرکوں کے لیے تیار کر دینے والے جذبات کو ابھارتا ہے۔ یہ حد درجہ کی عقلی قوت سے بھی مالا مال ہے اور حد درجہ کا جذباتی زور بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے عقیدے زمانے کی ہزاروں گردشوں کے گزر کر بھی بے جان اور بے قوت اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم پیچھے سے اس اعتقاد کو اپنے اندر سے کھرج کر آئے ہوتے، اور یہ نہیں تو کم سے کم اب سات سات سال کے دور آزادی میں اس فیصلے پر پہنچ جاتے کہ اس اعتقاد کو ساتھ لے کر ہم زندگی کا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھائیں گے۔ یہ کام اگر ہو سکتے والا تھا تو اسے اب تک ہو جانا چاہیے تھا۔ اس اعتقاد کو ہمیں چھانسی پر لٹکا کر امداد کی لاش فرسودگی کی قبر میں دفن کر کے، اوپر سے فاتحہ، قل اور چالیسویں کی ساری رسوم پوری کرنے کے بعد صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ اب ہم مسلمان نہیں رہے ہیں ہم نے صدیوں پرانے اسلام سے فارغ خطی حاصل کر کے نئی راہوں پر چل نکلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن یہ کام نہیں ہو سکا۔ جابر سے جابر بادشاہتوں کو اس میں ناکامی ہو چکی ہے۔ گونا گوں ذہنی، مذہبی، کلامی اخلاقی اور فرقہ وارانہ فتنوں سے یہ بازی ہار نہ ہوئی۔ جینگیز دہلا کو کی تلواریں اس کھیل کو جیت نہ سکیں۔ مغربی امپیریلزم کے لاؤ لٹکر اس لڑائی میں فتح نہ پاسکے۔ خود بڑے عظیم مہند میں کانگریس کی متحدہ قومیت اور سیکولر ڈیموکریسی کی طوفانی دعوت چارے اعتقاد کے قلعے کو سر نہ کر سکی۔ کسی سرسید اور نیاز فتح پوری اور کسی غلام احمد اور کسی پرویز کی مساعی اس معاملے میں بگ و بار نہ لاسکیں۔ تو لوگو! اب اور کس شجر گھڑی کا اور کس پہلوان کا اور کس نئے ہتھیار کا انتظار کر رہے ہو کہ چارے چہینے کے بعد اس اعتقاد کے مطالبوں اور تقاضوں سے جہاں چھڑائی جاسکتی ہے۔

اگر مسلمان ایک زندہ قوم ہیں تو ان کا اعتقاد ایک اہل قوت ہے۔ اس اہل قوت کو غیر موجود فرض کر کے کوئی دنیوی ہیئت اور کوئی سیاسی تقدیر تجویز یا اختیار نہیں کی جاسکتی۔ تاریخ جو قدم بھی اٹھائے گی اس اعتقاد کی رضامندی سے

اٹھائے گی، یہ اعتقاد اگر اس کا ساتھ نہیں دے گا تو تاریخ کی ندی کا ایک ایک قطرہ منجمد ہو کر اپنی جگہ پر تھم جائے گا اور کسی دوسری طاقت کی مجال نہیں کہ وہ اس کے بہاؤ کو جاری کر سکے۔ چنانچہ آج سات برس سے یہ بہاؤ اسی لیے رکا ہوا ہے۔ جب اس اعتقاد کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے، از سر نو حرکت شروع ہو جاتی ہے اور جب یہ اہمیت نظر انداز کی جاتی ہو تو پھر ڈیڈ لاک پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں اور معاشروں کے مستقبل کو بنانے والا ایک بڑا زور دار عامل ان کی اپنی تاریخ ہوتی ہے کسی کا مستقبل ہوا میں کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ ماضی کی مضبوط زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ واقعات کا تسلسل ہوتا ہے جو نیچے سے جس بیج پر چلا آ رہا ہوتا ہے اسی کے مطابق آگے کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انسانی زندگی میں یکا یک کوئی ایسا نقشہ ابھرا آئے جس کے نیچے واقعاتی تسلسل سرے سے موجود نہ ہو، ایک دستور ایسا اس کے ذہن سے نکلے جسے پچھلی ساری تاریخ سے کوئی رابطہ نہ ہو۔ ایک سیاسی مہیت ایسی نمودار ہو جائے جس کا ماضی سے کوئی جوڑ نہ ہو۔ معاشرا ایسے نظریے اور نصب العین کو لے کے اٹھ کھڑا ہو جسے پچھلی تاریخ نے کبھی اپنی گود میں لے کر پالانا نہ ہو۔

پھر کیا ہماری کوئی تاریخ نہیں؟ کیا ہم یکا یک ابھی ابھی منصفہ شہود پر ابھرے ہیں جنہیں درٹے میں کوئی تاریخ نہیں ملی، بلکہ جو کچھ بھی بنانا ہے وہ اب بنانا ہے؟ کیا ہماری کوئی ماضی نہیں جسے ہم اپنے مستقبل کی بنیاد بنائیں؟ کیا ہمارے پاس ملی تجربات کا کوئی خزانہ نہیں کہ جس کی روشنی میں ہم تعمیر نو کا نقشہ بنائیں؟ کیا ہمارا سرمایہ دوش کچھ نہیں کہ جس کے بل پر اپنے فردا کا آغاز کریں؟

اگر ہماری کوئی تاریخ ہے — اور یقیناً ڈیڑھ ہزار سال کی عظیم تاریخ ہے — تو کیا کوئی ترکیب ایسی ہے کہ ہم اس کے نعوش کو وقت کے اوراق پر سے دھو ڈالیں؟ ہم اس کے نشانات کو اجتماعی حافظے سے الگ کر سکیں؟ ہم ماضی اور مستقبل کا رشتہ کاٹ ڈالیں، ہم دوش اور فردا کے جوڑ کو کھول دیں؟ ہم اپنے آنے والے کل کا پوند اپنے گزے ہوئے کل اور آج سے جدا کر سکیں — یہ قطعی طور پر ناممکن ہے؟

ہماری تاریخ ایک ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ہے، ہماری تاریخ ہمارے فکر و شعور، ہمارے جذبات و احساسات اور ہمارے خلق و کردار پر اپنی چھاپ ڈالے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے

ہماری تاریخ ہمارے سینے میں گھر کٹے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمارے دماغوں کی تہوں میں اتری ہوئی ہے، یہ تاریخ ہماری اجتماعی زندگی کا گوشت پوست بن چکی ہے۔ ہم اپنے اس خزانہ بیش بہا کو جب سے پیدا ہوئے ہیں کدھوں پر لادے چلے آ رہے ہیں۔ اس سرمایہ حیات کو ہم سینوں سے لگائے ہوئے جادو حیات پر گامزن ہیں۔ یہ ہماری فکر میں کر دہی لیتی ہے، یہ ہمارے جذبوں میں متحرک ہے، یہ ہماری تقریروں میں بولتی ہے، یہ ہماری تحریروں میں ظہور کرتی ہے۔ یہ ہمارے شعروں میں مسکراتی اور آنسو بہاتی ہے، یہ ہماری کہانیوں میں اپنی رام کہانی کہتی ہے، یہ ہمارے نعروں میں اپنے راگ الاپی ہے۔ یہ ہمارے ارادوں کی امڈتی ہوئی بوجھل گھٹاؤں میں بجلی بن کے کوندتی ہے اور یہ ہماری تحریکوں کے سیل تند و تیز میں لہریں بن کے آگے بڑھتی ہے۔

پھر یہ نثر مناک تاریخ ہوتی تو یقیناً اس قابل تھی کہ اسے دریا برد کر دیا جائے۔ یہ اگر قدر و قیمت سے خالی ہوتی تو ایسی سلوک کی مستحق ہوتی کہ نہایت بے رحمانہ اپرین سے اس کی جڑوں کو ہم اپنے اجتماعی ذہن سے کھرج کر الگ کر دیتے۔ لیکن یہ ایک ایسی قوم کی حدود و حدود حیات کی داستان ہے جس نے انسانیت کو ایک پاکیزہ فکر، ایک ہمہ گیر نظر یہ حق، ایک نظام صالح، ایک اجتماعی اخلاق اور ایک روشن تہذیب دی ہے جس نے علم و فن کو اپنی خدمات سے چار چاند لگا دئے ہیں جس نے انسان کو اس کے پورے حقوق دلائے ہیں جس نے ترقی کے وہ دروازے کھولے ہیں جن پر فضل پر فضل لگے ہوئے تھے۔ اور ہاں یہ اس عظمت مآب قوم کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کہانی ہے جس نے ظلم و جبر کی بے شمار گھاٹیاں طے کیں مگر اپنی منہاج فکر کا کوئی حصہ راستے میں ضائع نہیں ہونے دیا، جس نے یسوی اور غلامی، معاشی خستہ حالی اور معاشرتی فساد، ہجرتوں اور جلاوطنیوں کے رنگا رنگ صبر آزما دور دیکھے مگر سنگین سے سنگین حالات اسے اپنی حقیقت سے غافل نہ کر سکے۔ اور ہاں یہ اس لامتناہی قوم کے تسموں اور آنسوؤں کی سرگذشت ہے جس نے انقلابات کی بے شمار گردشوں سے گزرنے کے بعد نہ اپنے مرکز اعتقاد کو چھوڑا، نہ اپنے نصب العین سے لگا ہٹنے دی۔ ایک زندہ قوم کی ایسی زندہ تاریخ کو دریا برد نہیں کیا جاسکتا۔

اس تاریخ کے حوادث کی تمام کڑیوں کو اوپر سے نیچے تک ہمارا جو مستقل شعور و احساس جوڑ کر ایک کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم ہیں۔ یہ شعور و احساس اگر نابود ہو سکتا تو اس تاریخ کا ربط ختم ہو جاتا، اس کے واقعات کا شیرازہ کھل جاتا اور ورق ورق الگ الگ بکھر گیا ہوتا، اس کا تسلسل ختم ہو جاتا اور کل اور آج کو جوڑنے والی کوئی طاقت

باقی نہ رہتی۔ پھر یہ شعور و احساس ایسا گہرا ہے اور موثر ہے کہ نظام کے انتہائی فاسد ہو جانے پر اور ماحول کے حد سے زیادہ بگڑ جانے پر اور معاشرے کی فضا کے شدید طور سے مکدر ہو جانے پر بھی ہمیشہ زندہ رہا ہے، یہ اُس حالت میں بھی زندہ رہا ہے جب کہ ناسازگار ماحول نے افراد کی عملی زندگیوں کو بالکل چوڑا کر ڈالا ہے، بلکہ حد یہ کہ آج ہمارے بعض بگڑے ہوئے افراد جو اسلام کے راستے میں روڑا بنے پڑے ہیں، وہ اپنی ساری حرکات کے بعد بھی یہ جرات نہیں کر سکتے کہ مسلم ہونے کا انکار کر کے اور اسلام سے صاف علیحدگی اختیار کر کے سامنے آئیں۔ ہماری پوری تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ پھر یہ شعور و احساس محض زندہ ہی نہیں رہا بلکہ یہ نظام اور ماحول اور معاشرے کے بگاڑ کے خلاف ہمیشہ ٹکرتیا رہا ہے۔ اس نے بار بار جدوجہد کے لیے ذہین اور شریف اور بہادر لوگوں کو ہمارے اندر سے اٹھا کھڑا کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کسی غیر اسلامی اصول اور ہیئت کے زیر سایہ چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور کسی غیر اسلامی نظریے سے مصالحت نہیں کرنے دی۔ اس نے اہلداد میں سمجھوتہ نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہمارے اندر کے اونچے لوگوں سے قابل یادگار قربانیاں دلوائی محض اور یہ قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے راستہ دکھانے والی مشعلوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ہمارا یہ شعور و احساس جو ہماری تاریخ میں وہاں سے یہاں تک چھایا ہوا ہے، پھل ساری قربانیوں کی طاقت اپنے اندر سمیٹ کر آج ہمارے اجتماعی ذہن میں موجزن ہے۔ یہ تاریخ جو صرف متغلامانہ تاریخ نہیں بلکہ ہماری جدوجہد کی تاریخ ہے، جو ٹھنڈے اور جامد مزاج کی نہیں بلکہ گرم اور متحرک مزاج کی مظہر ہے، وہ ناسازگار حالات سے دب جانے والے ارادوں کی نہیں، بلکہ مخالف قوتوں سے ٹکر جانے والے عزم کی آئینہ دار ہے کیا یہ ایسی غیر موثر چیز ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے جو بہر زندہ کے مزاج سے برعکس قسم کے کسی دستور اور کسی سیاسی ہیئت کو اپنے سائے میں پنپنے دے؟ کیا یہ تاریخ جس کے سارے کے سارے ابواب احیائے اسلام کی تحریکوں کی رودادوں سے بھرے ہیں، آج ان سارے ابواب پر خط نسخ کھینچنے والا کوئی سیاسی نظریہ و نظام اختیار کیا جا سکا؟ دستور ہی چلے گا، نظام وہی جم سکے گا جو اس تاریخ میں کارفرما رہنے والے ہمارے ملی شعور و احساس سے مطابقت رکھتا ہو۔ ورنہ گول خانے میں چوکھوٹی چیز کو فٹ کرنے کی کوشش، قوم کو کسی چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔

ایک ملت یا معاشرے کے خارجی واقعات و حالات ہی کا نام تاریخ نہیں ہوتا بلکہ تاریخ بنانے والی

بڑی طاقت خود خیالات کی طاقت ہوتی ہے۔ ملت کا اجتماعی ذہن جہاں حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے وہاں خیالات کی طاقت کے ذریعے خود ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوادث اور اجتماعی ذہن کے فکر و خیال کی لہریں آپس میں جو عمل و ردِ عمل جاری رکھتی ہیں۔ ان کے مشترک عمل سے تاریخ تشکیل پذیر ہوتی ہے تاریخ اجتماعی ذہن کے زیر اثر بنتی ہے اور اجتماعی ذہن تاریخ کے زیر اثر ارتقا کرتا ہے۔ پس کسی ملت اور معاشرے کا اجتماعی ذہن خود ایک ایسی طاقت ہے جو اس کے مستقبل کو بنانے والے عوامل میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اجتماعی ذہن کا سمندر ہوتا ہے جو اپنے اندر سے خیالات کی رویں اور لہریں اٹھاتا ہے، حوادث اپنے پتھر اس کے اندر پھینکتے ہیں تو بھنور بنتے ہیں اور ان کے گرد لہروں کے دائرے بن کر بھیلے جاتے ہیں، انقلاب کے جھکڑ چلتے ہیں تو وہ پانی کو اپنی سمت پر دھکیلتے ہوئے جنبشیں پیدا کرتے ہیں، پھر دوسرے سر چٹپوں سے بہہ کر آنے والے افکار و خیالات کے ندی نالے اس میں آکر گرتے ہیں تو دوزخ ان کے ریلے اپنا اثر ڈالتے جاتے ہیں۔ اجتماعی ذہن کا سمندر ان مختلف حرکت زا طاقتوں کے ذریعے ہر آن بلویا جاتا رہتا ہے اور ہر آن وہ اپنی سطح کو بحال اور اپنی اندرونی لہروں اور روؤں کو غالب رکھنے میں زور کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا اجتماعی ذہن ابک ایسا سمندر ثابت ہوا ہے جس کی داخل رویں اور لہریں بیرونی تحریکوں پر ہمیشہ چھائی رہی ہیں۔ مثلاً روم و ایران کی تہذیب برتری نے ہمارے اوپر اثر ڈالنا چاہا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ پھر یونان کا فلسفہ آگے بڑھا لیکن بہت جلد اس کا زور ٹوٹ گیا۔ پھر عجمی تصوف نے حملہ کیا لیکن ہمارے اجتماعی ذہن نے اس کے مقابلے میں بھی اپنی امتیازی ساخت کو بحال کر لیا۔ ہندو کلچر نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش کی، لیکن نصیب میں چند دراڑیں ڈالنے سے زیادہ کچھ نہ کیا جاسکا۔ آخر میں جدید مغربی ماقہ پرستانہ فکر تمدن نے ایک بے پناہ یورش ہمارے اوپر کی ہے لیکن ہر ہر مورچے میں فاتحانہ اور غالبانہ طاقت کے ساتھ زور آزمائی کرنے کے باوجود یہ طوفانی طاقت بھی ہمارے اجتماعی ذہن کی ساخت کو توڑ نہیں سکی۔

فکر و خیال کی دنیا میں جو معرکے ہماری تاریخ میں لڑے گئے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ کے منہگاموں کے بعد ہمارا اجتماعی ذہن جس طرح اپنی جگہ پر بار بار قائم ہو جاتا ہے اس کا ریکارڈ ہمارا سوا ہزار سالہ ملی لٹریچر ہے۔ یہ لٹریچر ہماری بنیادی فکر کا پورا پورا جوہر شروع سے آخر تک اپنے اندر لیے چلا آ رہا ہے۔ اس لٹریچر سے خارج کے ہر فکری حملے اور اندر کے ہر نظر باقی فتنے کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس لٹریچر سے دفاعی جہاد کی ساری کوششوں کا اندازہ لگایا

چا سکتا ہے۔ یہ لٹریچر بتاتا ہے کہ ہماری دلیل کی قوت کتنی مضبوط اور ہمارے ایمان کی طاقت کتنی اہل ہے۔ اس
 لٹریچر میں ہماری اخلاقی قدریں محفوظ ہیں۔ یہ ہماری اعلیٰ اور نابندہ روایات کو آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ
 ہمارے دیرینہ اور گہرے جذباتوں کا آئینہ دار ہے اور یہ ہمیں وہ چیز دیتا ہے جو ہماری ساری تاریخ کے واقعاتی
 و فکری تصادموں کے اندر چٹان کی طرح جھجھکی رہتی ہے اور طوفانی تاریکیوں میں جگمگاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں
 یہ ہمارا وہ ذہنی سرمایہ ہے جو مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ تفسیر کے دفتر دیکھئے یا احادیث کے ذخیروں کا جائزہ
 لیجیے، فلسفہ و تصوف کی کتابوں میں سامنے رکھئے یا طب اور کیمیا کی تاریخ اور علم انیات پر تصانیف ملاحظہ فرمائیے
 یا اخلاق، سیاست، معیشت اور مالیات پر، ٹھوس معلوماتی نتائج کاوش پر نگاہ ڈالیے یا بلکہ پچھلے ادب شعریہ
 پورا لٹریچر مجموعی حیثیت میں بول کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک مسلم ملت کا سرمایہ فکر و کاوش ہوں۔ پھر بالکل قرون اولیٰ
 کے علمی کارناموں سے گذریئے، یا قرون متوسطہ کے، یا بالکل آخری دور کے یہ سب ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہیں اسلام
 بارگاہ تک لے جاتے ہیں اور ہمیں ہمارے اہل مرکز ذہن سے ہٹنے نہیں دیتے۔ اس آخری دور میں خود اس بڑے عظیم
 کے مسلم لٹریچر کے عجائب خانے میں داخل ہو کر دیکھئے تو یہاں آپ کو شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبد الحق
 محدث دہلوی، شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد امجد
 سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا
 محمد علی جوہر۔ علامہ شبلی نعمانی، اکبر شاہ خاں نجیب آباد، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا
 علامہ اقبال۔ ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبد الماجد دریا بادی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،
 مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے بے شمار اہل علم کی کتابوں کے انبار کے انبار ملیں گے، جن سے
 کوئی بھی مطالعہ کرنے والا نچ بچا کے نہیں نکل سکتا، بلکہ وہ لوگ بھی جو بظاہر کچھ انوکھی باتیں کرنے والے ہیں یا
 کسی پہلو سے بہک گئے ہیں ان کے قلبی کام میں بھی اسلام کے کچھ نہ کچھ پہلو ضروری نمایاں ہیں۔ یہ حیثیت مجموعی
 اس سارے علمی سرمایے کو دیکھیے تو یہ نئی نسلوں کو اسلام سے ہٹانے والا نہیں اسلام کی طرف کھینچ لے جانے والا
 اور اسلامی حس کو بیلار کرنے اور اسلامی شعور کو زندہ کرنے والا ہے۔ صحافت اور خطابت کو بھی اگر اجتماعی ذہن کے
 اظہار کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے لٹریچر کے ساتھ لے لیا جائے تو ان میدانوں میں بھی اسلام بڑا ہوا ملے گا۔

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن بھی طرح بہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریچر کی سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے من جانب اللہ اور بروحق اور نور ہدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طبعی پڑھتے ہیں، قرآن جسے غانوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نتھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انہما درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے ذہنی نصاب کا اہم جز ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چین زاروں پر ہمیشہ ابر بہار بن کے برسی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سوا بزرگسال لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کار فرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جاسکتا ہے کہ کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علمی الزم کسی دوسری شکل میں کر دیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ لجنہ اد کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی چھو منتر سے اس کے مزاج کو بدلا جلا سکتا ہے، اور نہ اسے نظر انداز کر کے ایک انچھی آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا منظر ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس قوم کا اجتماعی ضمیر مر جاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور یہ صبر بھی اسے لے جانا چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ وہ نئے نئے سانچوں میں پڑ کر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نئی نئی نکت کو

رُخ کر کے سفر کا آغاز کر سکتی ہے۔ وہ خیر و شر کے معیارات اور قدروں کے پیمانوں کو باز رہا تو ذکر نئی صورت دے سکتی ہے۔ اب اگر بیمار کوئی اجتماعی ضمیر سرے سے نہ ہوتا، یا ہونا تو مر گیا ہوتا، یا زندہ رہتا مگر مسخ ہو چکا ہوتا تو یا سانی ہم ہر بنے نکا موڈ مڑ سکتے تھے۔ مگر یہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ ایک مستقل حس موجود ہے کہ حالات کی جو تبدیلی اسلام کے حق میں واقع ہوتی ہے وہ اس پر اطمینان کی کیفیت محسوس کرتے ہیں اور زندگی جو موڑ بھی اسلام کے خلاف مڑتی ہے اس پر وہ مضطرب ہونے لگتے ہیں اور ان کا یہ اضطراب مسلسل زندہ رہتا ہے۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں کسی ایسی حالت پر راضی نہیں ہونے دیتا جو غیر اسلامی فکر و عمل کی مظہر ہو۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو زندگی کو مذہب و سیاست کے دو خانوں میں بانٹ کر دو متضاد نظریوں کو یکجا کرنے پر کبھی امن چین نہیں پانے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جس کے زیر اثر وہ ہر اس تضاد اور تصادم پر تالاں ہونے ہیں جو ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو غیر اسلامی نظاموں کی چمک دمک سے ان کو مرعوب نہیں ہونے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں ہر باطل کے خلاف ذوقِ تعمیر سے سرشار کر کے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔

اب یا تو کوئی ایسا کامیاب نسخہ کسی بقراطِ دوران کے ہاتھ آجائے جس کے استعمال سے یہ ضمیر قطعی طور پر مچلے یا اسے مسخ کر کے کوئی اور شکل دی جاسکے، ورنہ جب تک یہ اپنا کام کر رہا ہے کسی بھی مسلمان قوم پر اسلام کے اصولوں سے ہٹا ہوا کوئی دستوری نقشہ ٹھونسا نہیں جاسکتا۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی قوم میں نظام وہ چلتا ہے جو اس محرکِ آزادی کے مطابق ہو جس کی تحریک سے اس نے سروھڑکی بازی لگا کر غیروں کی غلامی سے نجات پائی ہو۔ چنانچہ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ہی زندگی کا وہ نقشہ، معاشرے کی وہ تقدیر اور قوم کا سیاسی نظم متعین ہو جاتا ہے جس پر آزادی کی نئی تعمیر شروع ہونے والی ہوتی ہے۔ اب غور فرمائیے، کیا مسلمانوں کو آزادی یونہی بلا کسی جدوجہد کے چھپر چھاڑ کر مل گئی ہے اور اب ان کو معلوم نہیں کہ اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر انہوں نے ہر ہر ملک میں آزادی جدوجہد سے حاصل کی ہے تو کیا یہ جنگجو بغیر کسی محرک کے واقع ہو گئی، یہ گاڑی کسی اسٹیم کے بغیر قرزوں کی مسافت طے کر گئی! لیکن اگر کوئی محرک تھا تو اس محرک سے ہٹ کر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں سوچ سکتے! سوال صرف یہ ہے کہ وہ محرک کیا تھا؟

وہ لوگ جو مسلمان قوموں کو مغربی نظام حیات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وہ گویا اس مفروضے پر چل رہے ہیں کہ مسلمان قومیں اس جذبے سے آزادی کی جدوجہد کر رہی تھیں کہ وہ مغربی نظام حیات کی طرف ماریج کرنا چاہتی تھیں اور سامراج اس میں حائل تھا، کیا یہ مفروضہ اپنے اندر ہزاروں حصے کی حد تک بھی کوئی صداقت رکھتا ہے، کوئی اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ البتہ قابل غور ہے ان لوگوں کا نظریہ جو یہ کہتے ہیں کہ غیروں کے معاشی استحصال سے نجات پانے کا شکمی محرک اصل کار فرما قوت تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اقوام کی جدوجہد آزادی کے محرکات میں یہ چیز بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ معاشی ظلم سے نکلنا چاہتی ہیں اور استقلال کی سطح پر آنا چاہتی ہیں تاکہ وہ جس کھیت کو بوئیں اس کی فصل خود کھا سکیں۔ لیکن کسی قوم کی مثال ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جو تنہا معاشی محرک کے بل پر آزادی کی جنگ لڑی ہو۔

لازمًا دوسرے محرکات شامل ہوتے ہیں اور مختلف محرکات میں سے کوئی ایک پیش پیش طاقت (GOVERNING FORCE) بن کر کام کرتا ہے۔ معاشی استحصال جس درجہ انسان کو کھٹکتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ یہ بات اسے مضطرب کرتی ہے کہ وہ جن اعتقادات، جن رجحانات، جن خیالات اور جن اخلاقی قدروں اور جن تاریخی روایات کو اپنا اصل سرمایہ حیات سمجھتا ہو، کوئی حکومت اجتماعی نظام کو ان کے بالکل مخالف راستے پر چلائے، جن ہتھیروں کو لوگ محبوب رکھتے ہوں ان کی قدر و قیمت ختم ہو جائے، جن کو وہ نفرت سے دیکھتے ہوں وہ پورے ماحول پر چھا جائیں جن کو وہ حرام سمجھتے ہوں وہ حلال ہو جائیں اور جن کو حلال گردانتے ہوں وہ حرام کر دی جائیں، جن امور کو وہ گناہ سمجھتے ہوں وہ لازمہ حیات بننے لگیں اور جس کو وہ صواب مانتے ہوں وہ حرم بنا دی جائیں۔ اپنی مرضی کے نظام اور ماحول کے بجائے جب برعکس قسم کا نظام اور ماحول کسی معاشرے پر مسلط ہو جاتا ہے تو وہاں رائے اور امنگیں اور دلچسپیاں ہر طرف سے بھنچ جاتی ہیں، گویا سانس گھٹنے لگتی ہے۔ خون کا دوران ٹھننے لگتا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ کرب ہے۔ یہی کرب جدوجہد آزادی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ہم جیسا کہ اوپر بیان کر آئے ہیں، ہمارا ایک مخصوص اعتقاد ہے اور زندہ اعتقاد ہے، ہماری ایک تاریخ ہے اور موثر تاریخ ہے، ہمارا ایک اجتماعی ذہن ہے اور فعال ذہن ہے ہمارا ایک مٹی ضمیر ہے اور جیتا جاگتا ضمیر ہے۔ غلامی کے ماحول نے جب ان میں سے ہر چیز سے ٹکرایا اور اسے بھینچنا شروع کیا تو اضطراب پیدا ہوا اور وہی اضطراب پھر محرک جدوجہد بنا۔ آپ چاہیں جس مسلمان قوم کی تازہ تاریخ کو اٹھا کے دیکھ لیں اس میں آپ کو یہ امر واقعہ ضرور ملے گا کہ مسلمان قوموں کی جدوجہد آزادی میں خود اسلام

حرکت و اقدام کر رہا ہے اور دینی طاقتیں ایسی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ جہاں بھی مغربی قوموں کے تسلط کے خلاف کوئی تحریک اٹھی ہے براہ راست مغربی فکر و تہذیب کے خلاف اٹھی ہے اور اعتقادی و دینی بنیادوں پر اٹھی ہے۔ ہر جگہ احیائے اسلام اور نظام اسلامی کی منزل تک پہنچنے کا جذبہ کام کرنا ملتا ہے۔ تقریروں اور نعروں کو دیکھئے تو یہی شہادت ملتی ہے کہ ان تحریکوں کی منزل ہر جگہ قرآن کے اصولوں پر اپنے ایمان کے مطابق ایک ریاست اور معاشرہ تعمیر کرنا ہے۔

تحریک پاکستان کی نوعیت بھی قطعاً یہی ہے۔ جدوجہد آزادی کے مختلف محرکات پر جو چیز چھپائی ہوئی ہے وہ ایک ناسازگار غیر اسلامی نظام سے نکل کر ایک اسلامی نظام تک پہنچنے کا جذبہ ہے۔ اس تحریک کا لٹریچر (جو کچھ وہ ہے) اس کی تقریریں، اس کے ریزولوشن، اس کے نعرے، اس کی بولی، اس کی اصطلاحات سب کے اندر یہی جذبہ بول رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم، عقیدے سے بننے والی قوم، ایک جداگانہ نظریہ حیات رکھنے والی قوم اور ایک مستقل تہذیب کی مالک قوم کی تحریک بن کے اٹھی۔ اسی لحاظ سے اس کو چلانے والی تنظیم مسلم لیگ کے نام سے سامنے آئی۔ اسی لحاظ سے زمین کے نقشے پر ابھرنے والی نئی مملکت کا نام پیشتر سے پاکستان رکھا گیا یعنی ایک پاک قوم کا گھر جو پاک اصولوں پر ایک پاک نظام برپا کرنے والی ہے۔

ہمارا یہ محرک آزادی پہلے دن سے انگلی اٹھا کر تبارہا تھا کہ ہمیں جانا کہاں ہے، پھر سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ کہ آج کچھ لوگوں کو کیوں التباس پیش آ گیا ہے کہ وہ سات برس سے بڑے سوچ رہے ہیں کہ ہم کیا کریں! اس محرک آزادی نے اب ایک تاریخی حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس سے آسانی سے پچھا نہیں چھڑایا جا سکتا اس کے تضاد رکھنے والا مستقبل یہاں کھینے کا نہیں۔

آخری موثر طاقت جو ہمارے مستقبل کا تعین کر رہی ہے، ہمارا ارادہ عمومی (POPULAR WILL) ہے اور یہی ساری چیزیں مل جل کر اس ارادہ عمومی کو پیدا کرتی ہیں۔ ان سارے موثرات کے شعوری، نیم شعوری اور غیر شعوری عمل سے اب ایک سوچا سمجھا ہوا ارادہ پوری کی پوری قوم میں کارفرما ہو چکا ہے۔ شہر اور قصبے ہوں، یا دور افتادہ دیہات، جہاں جاییے یہ ارادہ اجتماعی یکساں موجزن ہے۔ یہ بڑے بڑے جلسوں کی صورت میں ظہور

کرنا ہے، یہ قراردادوں اور ریزولوشنوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تقاریر اور مقالات میں اڈر رہا ہے یہ نجی مجالس اور گفتگوؤں پر اثر انداز ہے، یہ جماعتوں اور پارٹیوں کے منشوروں اور پروگراموں میں سے بول رہا ہے۔ انہماک سے کب تک جھٹلاؤ گے؟ قوموں کے جذبات اور میلانات جب تک دھندلے ہوں تو ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ متعین شعوری شکل اختیار کر کے ارادہ عمومی بن جائیں تو پھر ان سے صرف نظر کرنے کی جرأت ایک حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی

اب تک کی گفتگو سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نظریہ جبریت کے قائل ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ کچھ ایسی نفسیاتی اور تاریخی اور طبیعی قوتیں برسرِ عمل آگئی ہیں جس کے اندر انسانی ارادہ بالکل بے بس ہے کہ ایک خاص سمت کے سوا کسی اور طرف نہ جاسکے۔ نہیں ہم انسانی ارادہ کی طاقت کی برتری کے قائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے۔ لیکن ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مختلف مؤثر عوامل جو کار فرما ہیں ان کے تقاضے کو اگر رد کر کے چلنا ہو تو اس کی صورت ایک ہی ہو سکتی ہے اور یہ کہ انسانی ارادہ ایک سخت انقلابی اقدام کے ذریعے ان عوامل سے ٹکر لٹے اور ان کو توڑ پھوڑ کر آگے نکل جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے سخت انقلابی اقدام کے لیے جو سرد سامان ہوتا ہے وہ موجود ہے یا اس کے ہم ہینچانے کی تیاریاں اب تک ہماری ارادی قوتوں نے کی ہیں یا ہمارے اندر ان تیاریوں کی ضرورت ہی کا کوئی احساس موجود ہے؟ ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے شعوری ارادوں نے انقلابی حرکت اگر شروع کی ہے تو ان عوامل کے خلاف جو اسلام کے خلاف پڑتے ہیں۔ لیکن وہ عوامل جو اسلام کے زیر اثر اور اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں ان کو ہمارے شعوری ارادوں نے قبول کر لیا ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہمارے ہند کی کوئی طاقت ان عوامل سے آنکھیں بند کر کے اندھا دھند قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ ضرور کر سکتی ہے، مگر ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ ایسی حماقت سے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ کوئی ایسا دستور مستقبل اور کوئی ایسی سیاسی تقدیر جسے مذکورہ بالا زردار عوامل کے خلاف قوم پرٹھونے کی کوشش کی جائے وہ ایک ایسا ناخوشگوار بارگراں بن کے ہمارے اوپر لڑے گی جسے اولین موقع ملتے ہی عوام سروں سے اتار چنکیں گے۔ ایسے دستور مستقبل اور ایسی سیاسی تقدیر کو محبت کے ساتھ نہیں، ہمیشہ نفرت اور بے دلی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے،

اس کے لیے کبھی جذبات عمل نہیں پیدا ہوتے بلکہ جمود پیدا ہوتا ہے جو تدریجاً اضطراب میں بدلتا ہے اور بالآخر انقلاب تک زوبت جا پہنچتی ہے۔ ایسی دھاندلیاں چارچہ مہینے، سال دو سال چل سکتی ہیں لیکن استقلال نہیں پاسکتیں ایسے چام کے سکے ایک آدھ دن چل جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ انسانی میں جو بھی بے ٹکی چیز لا کے نصب کر دی جائے اسے تاریخی عوامل توڑ پھوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

یہ جو آئے دن کبھی کنٹرولڈ ڈیموکریسی اور کبھی عبوری دستور کے منصوبے نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کے موجدوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے سمجھ بوجھ پانے کی دعا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کے موثر عوامل کشتی لڑنے کا فیصلہ نہ کریں۔ اس کشتی میں کوئی پہوان پالا نہیں مار سکتا۔

دوسری طرف ہم عوام کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ جس نظام زندگی کے لیے اپنے اندر ایمان اور جس کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم رکھتے ہیں، اس کی خاطر اگر وہ انگریزی تسلط اور ہندو امپیریلزم کے خطرے سے نبرد آزما ہو کر یہاں تک آگئے ہیں تو آئندہ بھی کوئی ناموافق صورتِ حالات ان کے آڑے نہیں آسکتی۔ چند مہینوں اور چند سالوں کی گردشیں بظاہر کتنی ہی ناسازگار اور مایوس کن کیوں نہ ہوں، اجتماعی رجحانات اور عمومی ارادوں کا راستہ روک نہیں سکتیں حالات جتنے ناسازگار ہوں زندہ قوموں کا دلوکہ عمل اتنا ہی زوردار ہو جانا چاہیے۔

تیز ترک گام زن منزلِ مادور نسبت

قصیدہ (ایک ضروری استدراک) اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابن صیاد کے شعلق آپکا حضرت عمر سے یہ فرمانا کہ اگر یہ دجال ہی ہے تو اس کے قتل کرنے واسطے تم نہیں ہو، اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی قتل کرنے کا کوئی حق نہیں؟ یا مثلاً ایک حدیث میں آپکا یہ ارشاد کہ اگر وہ میری زندگی میں آیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا بیٹا ہرگز حاکم و ناصر ہے ہی؟ اب یہ ظاہر ہے کہ اس دوسرے جزو کی وینی اور اصولی حیثیت وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جزو کی ہے اس کی تمام تفصیلات کو بھی پہلے جزو کی طرح یقینی قرار دینا زیادتی ہے بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔

صفحہ ۵۷ - سطر ۵، ۵ کی عبارت میں یہ ترمیم کر دی جائے:

لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سارے نیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال نہیں آیا ہے؟

اسی صفحہ پر سطر ۷ تا ۹ کو اس طرح لکھا جائے:

اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق نہ نکلے تو یہ اس کے منصب پر تعلق ہرگز خارج نہیں ہے۔

خاکہ (ابوالاعلیٰ)